© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

سائنس اور فلسفہ کی ترقّی میں قرآنِ کریم کا حصّہ

اورا ۲

بڑا ہاسلام کی اثر آفرینیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس نے جہاں توحید کے اسرار فاش کیے ہیں۔ بہت انسانی کا پرچم لہرایا ہے، اخلاق و سیرت، کے گوشوں کو پاکیزگی عطا کی ہے، جہاں دلوں میں محبت الٰہی کی شمعوں کو روشن کیا ہے اور ایسے پاکیزہ اور اونچے معاشرہ کی تخلیق کی ہے کہ جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عالم قاصر ہے۔ وہاں مذاہب عالم پر اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے فکر و تعمق کے دواعی کو اکسایا ہے، عقل و خرد کے اجالوں کو عام کیا ہے اور دنیا کے تیرہ و تاریک افق پر استدلال و استنباط کے نئے نئے آفتاب ابھارے ہیں۔

کیا یہ بات آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے کہ بادیہ نشینان عرب تھوڑے ہی عرصے میں تہذیب و تمدن کے فراز اعلیٰ پر فائز ہو جائیں، حکمت و دانش کے افسردہ میکدوں میں پھر سے جان ڈال دیں، اور علوم و فنون کے اجڑے ہوئے دیار میں دوبارہ چہل پہل پیدا کر دیں، اور کیا یہ امر تعجب خیز نہیں کہ عرب کی اُمّی اور ناآشنائے حرف قوم دیکھتے ہی دیکھتے فلسفہ و حکمت کے تخت و اورنگ پر تسلط جمالے اور نہ صرف یونانیوں کے بادۂ فکر و اندیشہ سے تشنہ کامانِ ادراک کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے بلکہ اس کے جرعوں میں کیف و ذوق کی ان سرمستیوں کا بھی اضافہ کر دے جو اسلام کی دعوت عرفاں کے ساتھ خاص ہیں۔

ہماری رائے میں یہ محیر العقول انقلاب نتیجہ ہے قرآن حکیم کی ان تعلیمات کا جن سے کہ تحقیق و تجسس کی روح بیدار ہوئی اور یہ تبدیلی اور عظیم تغیر مرہونِ منت ہے اس وحی کا جس کا حرف آغاز اقرأ ہے۔

قرآن حکیم نے کیوں کر مسلمانوں میں خالص علمی ذوق کی پرورش کی اور کس طرح ان کے اسلوب فکر کو

© rasailojaraid.com

سائنس اور فلسفہ کے حسین سانچوں میں ڈھالا؟ اس سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں ان چار نکات پر غور کرنا ہوگا۔

(۱) قرآن حکیم نے اس عالم ہست و بود کی معروضیت (Objectivity) کو واشگاف الفاظ میں تسلیم کیا۔ زندگی کو احترام کی نظر سے دیکھا اور بتایا کہ مسلمان کا نصب العین دنیا و آخرت کے حسن اور نکھار سے بہرہ ور ہونا ہے۔

(۲) اس کتاب ہدیٰ نے اس حقیقت کو کھول کر بیان کیا کہ اس کائنات میں جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے نظام و قاعدہ کی استواریاں پائی جاتی ہیں، اور اس کی تخلیق میں متعین غرض و غایت پنہاں ہے۔

(۳) اسی صحیفۂ مبارکہ نے پہلے پہل اور ہمیشہ کے لیے اس مغالطہ کو دور کر دیا کہ دین اور عقل و تقاضوں میں تضاد رونما ہے۔

(۴) اور یہ بھی اسی کتاب کا اعجاز ہے کہ اس نے فکر و استدلال کی ان راہوں کی طرف رہنمائی کی جنھیں ہم منطق کی اصطلاح میں استقرا (Induction) کہتے ہیں۔

اس کائنات کی نوعیت کیا ہے؟ آیا یہ خوبصورت آسمان، یہ ہرے بھرے اشجار، یہ سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے دریا، یہ ٹھوس پتھر، اور استادہ پہاڑ حقیقی وجود سے بہرہ یاب ہیں یا ان کا وجود محض باطل اور نظر و خیال کی سیمیائی ہے؟ اس بارے میں ارباب فلسفہ و مذہب میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی پرورش و ارتقا سے متعلق دو بالکل ہی متضاد نظریے دنیا میں رائج رہے ہیں۔ اگر کائنات موجود ہے اور یہ عالم ہست و بود وجود خارجی سے متصف ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے فکر و نظر کا صحیح اسلوب اختیار کیا ہے اور علوم و فنون کی نشاط آفرینیوں اور تہذیب و تمدن کی نقش آرائیوں کے لیے وجہ جواز ڈھونڈ لینے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

اور اگر اس عالم کی حقیقتیں صرف تصور (Ideas) یا صورت (Shadows) کا کرشمہ ہیں یا ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے زندگی کی اہمیتوں کو گھٹایا ہے اس کی غرض و غایت کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے، اور ایسی راہبانہ اور غیر عمرانی زندگی کی حوصلہ افزائی کی ہے جس سے انسانیت کو بجز قنوط اور مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نفی و ایجاب کے یہ دونوں راستے نہ صرف جدا جدا ہیں بلکہ دونوں دو مختلف منزلوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ایجاب کے معنی زندگی کی گہما گہمی اور ارتقا کے ہیں۔ علم و فن کے فروغ کے ہیں۔ آگے بڑھنے اور کائنات کی ناہمواریوں پر قابو پانے اور اس کو اپنے دائرۂ تسخیر میں لانے کے ہیں، اور نفی کا مطلب محرومی، یاس، قنوط اور جہل و نادانی یا جمود و پسماندگی کو اپنانا ہے۔

اس بنا پر اسلام نے اس عالم آب و گل کو اگر تسلیم کیا ہے تو اس کے معنی صرف یہاں کی ابھرتی ہوئی اور نمایاں و محسوس حقیقتوں کو مان لینے ہی کے نہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے انسانی علم و بصیرت پر پورے طور سے اعتماد کا اظہار کیا ہے اور فکر و نظر کا ایسا اسلوب اختیار کیا ہے جس کی یقین افروزی کسی تشکیک اور ا[illegible]۔ دوسرے لفظوں میں اسلام نے کائنات کی معروضی حیثیت کو مان کر اس اساس اور بنیاد کی بڑھا[illegible] ہے کہ جس پر آگے چل کر انسانی فکر و تجربہ کے غرفے استوار ہوتے ہیں۔

یونانی حکما کی اکثریت اس عالم رنگ و بو کو مانتی تھی ان میں اگر نزاع صرف یہ دو باتیں تھیں کہ اس کی ترکیب و ساخت میں کون عناصر کو دخل ہے۔ یا یہ کہ یہ عالم، ساکن و راکد (Static) ہے یا متحرک (Changing)۔ افلاطون ان میں پہلا شخص ہے جس نے اس مسئلہ سے انحراف اختیار کیا، اور بحث و نزاع کے اس دھارے کو ڈھائی سو سال کے بعد اس نکتہ کی طرف موڑ دیا کہ جس عالم مادی کی ترکیب و ساخت کے بارہ میں اب تک یہاں مناظرہ گرم رہا اس کے متعلق سوچنے کی بات دراصل یہ ہے کہ آیا یہ عالم حقیقی عالم بھی ہے یا نہیں۔ افلاطون کے نزدیک یہ دنیا، حقیقی دنیا کا محض عکس یا مثنی (Copy) ہے اور وہ حقیقی، مکمل اور غیر متغیر دنیا صرف تصور (Idea) یا صورت (Form) کی جلوہ گری سے تعبیر ہے۔

افلاطون کا اشکال دراصل اس عالم کی ناہمواریوں پر مبنی ہے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ یہاں نقص (Imperfection) یا شر (Evil) ہی کا دور دورہ ہے، زلزلوں کی تباہ کاریاں اور تغیر و فنا کی ہولناکیاں ہیں تو وہ ایسے عالم کو حقیقی عالم ماننے سے انکار کر دیتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ اس نقص یا شر کو ڈیمی ارج (Demiurge) کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا کہ جس نے ان تصورات کاملہ اور نصب العینی صور کو مادہ میں مرتسم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نقص مادّہ کا ہے۔ اس کی صلاحیت قبول و پذیرائی کا ہے کہ ان کامل تصورات کو پوری طرح اپنا نہیں سکا ہے۔

افلاطون نے کائنات کی اس تعبیر سے گو تصوریت (Idealism) کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالم مادی کی مکمل نفی پر منتج ہوئی تاہم اتنا غنیمت ہے کہ اس نے ایک صورت گر ازلی (Divine Sculptor) اور مادہ کے وجود کو تو بہرحال تسلیم کیا۔

عیسائیت نے جب اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ مذہبی اذعانیات (Dogmas) کو عقل و خرد کی روشنی میں پیش کیا جائے تو اسے افلاطون کے نظریات اور پلاٹینیوس کی تشریح، پذیرائی کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوئی، جن میں کہ تصور یا روح کو قدرتاً فوقیت و امتیاز حاصل ہے اور جسم کی حیثیت ایسی برائی یا رکاوٹ کی ہے جو قلب و روح کی پرواز اور ترقیات میں حائل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک ایک شخص جسم کے تقاضوں سے رستگاری حاصل نہیں کر لیتا اور جسمانی خواہشوں اور ولولوں سے دامن کشاں نہیں رہتا اس وقت تک یہ نجات کے استحقاق سے محروم رہتا ہے۔ ظاہر ہے یہ طرز فکر ٹھوس اور ضروری حقیقتوں سے گریز اور فرار پر مبنی ہے۔ اور سوچنے کے اس نہج کا منطقی نتیجہ ہے جو افلاطون اور اس کے شارح پلاٹینیوس کے تتبع میں عیسائیت نے اختیار کیا۔

اگر کائنات کے مظاہر معروضیت سے متصف ہیں تو پھر جسم بھی معروضی ہے اور اس کے تقاضے بھی اپنی آغوش میں معروضیت لیے ہوئے ہیں اور اس بنیاد پر اگر غور کیجیے تو ان تقاضوں اور خواہشوں کی پرورش اور ارتقا کا مسئلہ بھی بجائے خود ایک حقیقت ملکی قرار پاتا ہے۔ اس بارہ میں فیصلہ کن نکتہ دراصل یہ ہے کہ کوئی بھی عمل، یا تگ و دو کی کوئی بھی صورت حتیٰ کہ مجاہدہ اور ریاضت بھی ان معنوں میں روحانی نہیں ہے کہ اس میں قطعاً جسم کا حصہ نہیں ہے، خواہش و تمنا کی کارفرمائی نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک کسی عمل یا فعل میں ___ جو بہرحال جسمانی ہی ہوتا ہے ___ روحانیت کا عنصر اس وقت ابھرتا ہے جب آپ اس کو ان محرکات نفسی کی بنا پر اختیار کرتے یا انجام دیتے ہیں جو کسی عظیم نصب العین یا کسی بلند اخلاقی قدر سے تعلق رکھتے ہیں یعنی جب یہ فعل یا عمل ذاتی منفعت کی سطح سے اونچا ہو کر کسی آفاقی یا انسانی مطمح نظر سے ہمقراں ہوتا ہے۔ ورنہ کوئی فعل یا عمل اپنے روپ میں روحانی یا غیر روحانی نہیں ہوتا۔ عمل و فعل کی یہ ثنویت اس غلط مفروضے پر مبنی ہے کہ انسان جسم و روح کی دو متضاد حقیقتوں سے ترکیب پذیر ہے۔ حالانکہ جسم و روح دو علیحدہ علیحدہ اور مخالف چیزوں کا نام نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت انسانی کے دو پہلو ہیں۔ دو پرتو ہیں۔ زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ انسان کے سوچنے اور عمل کرنے کی دو سطحیں ہیں۔ ایک سطح کو ہم روحانی کہتے ہیں اور ایک کو جسمانی۔

© rasailojaraid.com

عالم و ما فیہ کو غیر حقیقی قرار دینے کی دوسری واضح مثال ہمیں ہندو اصول "مایا" میں ملتی ہے جس کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہے کہ یہ دنیا اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ دھوکہ ہے اور ہرگز اس لائق نہیں کہ انسان یہاں رہے۔ یہاں کی دلچسپیوں سے دل بہلائے۔ یا تہذیب و تمدن کی طرفہ طرازیوں کو شائستۂ اعتنا سمجھے۔

"مایا" کے اس منفی فلسفہ نے زندگی کے کارزار میں اپج، جرأت، اور تخلیق و اختراع کی نشاط آفرینیوں سے ہندوؤں کو کس درجہ محروم رکھا، یہ صرف تاریخ ہی کا مسئلہ نہیں زمانۂ حال کا اشکال بھی ہے۔ کیونکہ کہ اس میں سوال یہ پوشیدہ ہے کہ آیا عالم کے بارہ میں یہ غیر سائنسی اور غیر ہمدردانہ نقطۂ نظر انسانوں میں اور اس کی روح پیدا کر سکتا ہے، اور اس کائنات سے متعلق اس گہرے لگاؤ، عمیق توجہ اور مبنی بر ڈھکر کرامات کو پیدا کر سکتا ہے۔ جو علم و عرفان کے لیے بمنزلہ اولیں شرط کے ہے۔ رادھا کرشنن نے بہبود Eastern Religions & Western Thought میں اعتراض کے اس تیکھے پن کو محسوس کیا ہے اور جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے جواب کی اس نوعیت سے ڈاکٹر شویزر (Schweitzer) کی تسکین ہوتی ہے یا نہیں۔ "مایا" کی اس فلسفیانہ اور متصوفانہ تعبیر سے ہم صرف یہ بات سمجھ پائے ہیں کہ ہندو اہل فکر نے مغربی تہذیب کے زیر اثر اس خلیج کو بالآخر محسوس کر ہی لیا ہے جو زندگی کے تقاضوں اور زندگی کی نفی کے مابین حائل ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس خلیج کی نشاندہی سب سے پہلے اسلام نے کی لیکن اس وقت نہ عیسائی اقوام نے اس پر غور کیا اور نہ ہندو فلسفہ نے "مایا" کی اس نئی تعبیر و تشریح کی ضرورت سمجھی۔ لیکن اب جب کہ زمانہ کے ارتقا نے دونوں کو زندگی کی شورشوں میں دھکیل دیا ہے۔ دونوں ہی جان گئے ہیں کہ رہبانیت اور "مایا" کا فلسفہ موجودہ زمانہ میں چلنے والا نہیں۔

یہ جان لینے کے بعد کہ کائنات کی معروضی حیثیت تسلیم کر لینے سے کیونکر سائنسی ذہن اور مزاج پیدا ہوتا ہے اور اس نقطۂ نظر کو اپنا لینے سے تہذیب و تمدن کے مختلف گوشوں میں کس درجہ دوررس اور خوشگوار تبدیلیاں معرض وجود میں آتی ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو کس کس اسلوب سے بیان کیا ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے:

(۱) اولم یر الذین کفروا ان السموات	کیا کافروں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین
والارض کانتا رتقا ففتقنھما وجعلنا من الماء	دونوں ملے جلے تھے ہم نے ان دونوں کو جدا جدا کر دیا اور تمام

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کل شیئٍ حیٍّ افلا یومنون ۲۱ — جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں کیا اس پر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

(۲) سورۂ عنکبوت میں ارشاد فرمایا،

خلق اللّٰہ السمٰوٰت والارض بالحق — خدا نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا۔
ان فی ذالک لآیۃ للمومنین ۴۴ — اور اس میں یقیناً صاحب ایمان لوگوں کے لیے نشانی ہے۔

سورۂ غاشیہ میں آیا ہے،

(۳) افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت والی السماء کیف رفعت والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت ۲۰ — کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے عجیب [illegible] ان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اور آسمانوں کی طرف نظر نہ کیسا بلند کیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں کے بارہ میں نہیں استادہ کیے گئے ہیں۔ اور زمین پر غور نہیں کرتے کہ کس ان کے پاؤں تلے بچھایا گیا ہے۔

سورۂ ملک میں ہے،

(۴) ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح ۵ — اور ہم نے قریب کے آسمانوں کو ستاروں کے چراغوں سے زینت بخشی

سورۂ شوریٰ میں وضاحت فرمائی،

(۵) فاطر السمٰوٰت والارض ۱۱ — آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔

سورۂ نحل میں اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ کائنات کو معروضیت کے لباس سے آراستہ کرنا، اور تخلیق و اختراع کے خلعت سے نوازنا ہی تو وہ صفت ہے جس کی وجہ سے ہمیں اپنی تمام مخلوق سے امتیاز حاصل ہے،

افمن یخلق کمن لا یخلق ۱۷ — کیا جو تخلیق و ابداع سے کام لیتا ہے وہ ایسا ہے، جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے۔

تخلیق عالم کے لیے قرآن حکیم نے جو پیرایۂ بیان اور الفاظ بیان کیے ہیں، ان سے ان تمام تصورات کی نفی ہو جاتی ہے جن کو تصوریت نے جنم دیا ہے۔

دوسرا نکتہ بھی کچھ کم اہم نہیں اگر یہ عالم بخت و اتفاق کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ اس کو حکیم و دانا خدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے بنایا ہے تو پھر ضروری ہے کہ اس میں نظم و ترتیب ہو، قاعدہ اور قانون ہو اور اس کو اس نہج سے ڈھالا جائے کہ انسان اس سے پورا پورا استفادہ کر سکے۔

جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے اس نے کائنات کے بارہ میں بار بار اس حقیقت کو پیش کیا ہے کہ اس کارگاہ حسن میں کہیں بھی بھونڈا پن یا نقص نہیں۔ کہیں بھی نظم و ترتیب کی کوتاہیاں نہیں۔ یہاں ہر چیز کا ایک انداز ہے اور ہر شے قرینہ اور ڈھنگ کی آئینہ دار ہے۔

قرآن حکیم اس عالم کو انسانی اغراض و مفادات کے منافی قرار نہیں دیتا۔ اس کو معاند اور غیر ہم آہنگ نہیں مانتا بلکہ اس کو اس لائق ٹھہراتا ہے کہ انسان یہاں رہ سکے۔ اس کی نشاط آفرینیوں میں شریک ہو سکے اور اس کے حسن اور نکھار سے ذوق و کردار کی زلف دوتا کو سنوار سکے۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہنا چاہیے کہ اس کے اندر نہاں ان جاری و ساری قوانین کو جان سکے، اور ان کو معاشرہ کی بہتری اور بہبود کے لیے استعمال کر سکے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ سائنس کو فی نفسہٖ غرض و غایت سے کوئی سروکار نہیں اس کا موضوع بحث تو صرف یہ ہے کہ یہ مادہ کے مضمرات ارتقا کو معلوم کر سکے، اور اس علم کی روشنی میں تجربہ و آگاہی کے مزید قدم اٹھا سکے۔ اس کا دائرۂ بحث صرف 'ہے' (Is) تک ہے۔ 'چاہیے' (Ought)، اس کے حدود بحث سے خارج ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ خالص سائنسی نقطۂ نظر سے یہ عالم کسی غرض و غایت کی طرف رہنمائی نہیں کرتا۔ یا یوں کہنا چاہیے اس بارہ میں اس کی روش قطعاً غیر جانبدارانہ ہے۔ اس سے نہ تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ عالم بامقصد ہے، اور نہ اس چیز کا اندازہ ہوتا ہے کہ بامقصد نہیں ہے۔ لیکن اگر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھیے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس عالم میں بغیر غرض و مقصد کو ماننے اور بنا کسی غایت و معنی کے تسلیم کیے، مظاہر ہستی کی کوئی معقول توجیہ ممکن ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں دو ٹوک سوال یہ ہے کہ یہ عالم مادی کیوں قاعدہ و قانون کی افادیتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ پانی کیوں پیاس بجھاتا ہے، کھانے سے کیوں سیری اور توانائی حاصل ہوتی ہے اور معدہ کی ترکیب و ساخت کیوں اس وضع کی ہے کہ وہ کھانوں کو آسانی سے جزو بدن بنا سکے۔ اسی طرح عقاقیر اور جڑی بوٹیوں میں صحت بخشی کی صلاحیتیں کیوں مضمر ہیں۔ زیادہ واضح لفظوں میں جواب طلب یہ سوال ہے کہ یہ عالم اور اس کے تمام مشمولات بحیثیت مجموعی کیوں ان خصوصیات کے حامل ہیں کہ ان سے بوقلموں ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ کیا یہ صرف انسان کی تلاش

© rasailojaraid.com

اور وریافت کا نتیجہ ہے کہ اس نے ان اشیاء میں افادیت کے مختلف پہلوؤں کو ڈھونڈ نکالا۔ یا افادیت کے یہ پہلو چونکہ پہلے سے اشیاء میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر و حکمت نے ودیعت کر رکھے تھے اس لیے ہماری طلب و جستجو کے نتیجے میں ہمیں معلوم ہوئے۔

ظاہر ہے کہ تخلیق کا یہ انداز صاف صاف غمازی کرتا ہے کہ یہ عالم ہست و بود بغیر کسی حکمت و ارادہ کے یونہی اس انداز کا نہیں بن گیا ہے کہ انسان یہاں رہ سکے۔ یہاں کی سازگاریوں سے لطف اندوز ہو سکے، اور یہاں کی ایک ایک چیز کو اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کر سکے۔ یا یہ جانا بوجھا اور سوچا سمجھا ہوا انتظام ہے جو انہی اغراض کے پیش نظر قائم کیا گیا ہے۔

ہم دراصل غایتی (Teleological) اسلوب فکر کی نمائندگی کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن حکیم نے اس عالم کے بارہ میں جس نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اس سے علم اور سائنس کے تقاضے کہیں زیادہ خوبی سے تکمیل پذیر ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب قرآن حکیم بار بار اس حقیقت کو بیان فرمائے گا کہ اس عالم کی ہر ہر شے تمہارے لیے ہے، حتیٰ کہ یہ اتھاہ سمندر، یہ وسیع و عریض زمین، یہ تاباں و فروزاں چاند اور سورج اور یہ لیل و نہار کی تبدیلیاں اور گردشیں تمام تر تمہارے ہی فائدے کے لیے وقف ہیں تو اس اسلوب اظہار سے لامحالہ انسان کے دل میں ان سب کو جاننے کی شدید خواہش کروٹ لے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ غایتی طرز استدلال پر کچھ اعتراضات بھی وارد ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان میں کا سب سے زیادہ مشکل اور تیکھا سوال یہ ہے کہ اگر کائنات کا یہ مرقع کسی باکمال ذات کا نقش حسین ہے تو اس میں مصیبت، ظلم، بیماری اور اندوہ و تشویش کے داغ دھبے کیوں نظر آتے ہیں۔ یا پھر ایک فلسفی کے الفاظ میں اگر اس دبستان کا نصف حصہ فکر، ذوق، حسن اور عقل و ہنر کے پھول بوٹوں سے آراستہ ہے تو دوسرے نصف حصے میں دشمنی، کینہ، بیماری اور حرص و آز کی عفونتوں کے ڈھیر کیوں پڑے ہیں؟

ہیوم نے اپنے مکالمات میں ایسی نوع کے اعتراضات پر تشکیک (Scepticism) کا قصر رفیع تعمیر کیا ہے کہ خیر میں آخر شر کے پیوند کی کیا ضرورت تھی اور حسن و زیبائی کے ساتھ قبح و عیب کی نمائش کا کیا موقع تھا؟ افلاطون نے تو یہ کہہ کر سوال کی سنگینی سے پیچھا چھڑا لیا کہ یہ عالم جس پر تم اعتراض کر رہے ہو حقیقی کب ہے؟ یہ تو حقیقت کی بھونڈی نقالی ہے۔ حقیقی عالم تصورات یا صور کا ہے جو واقعی خوبصورت مکمل اور غیر متغیر ہے۔ لیکن ہمارے لیے یہ مشکل ہے کہ جواب کی اس نوعیت پر اطمینان کا اظہار کر سکیں اس لیے کہ

© rasailojaraid.com

ہم تو قرآن کی رو سے اس عالم کی معروضیت کے پُرزور حامی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس اشکال سے نکلنے کی تین معقول صورتیں ہیں:

(۱) یا تو ہم کیٹس (Keats) کے اس موقف کو تسلیم کرلیں کہ یہ عالم درحقیقت ایک درس گاہ ہے۔ جہاں عملی تربیت دی جاتی ہے کہ ہم شر اور تضاد کی ناسازگاریوں کو خیر و توافق کے سانچوں میں ڈھالنے کا فن سیکھیں۔ دوسرے لفظوں میں جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں جو تضاد و نقص پایا جاتا ہے وہ قدرت کے سہو و تغافل کا نتیجہ نہیں بلکہ اس لیے ہے تاکہ ہماری عقل و دانش میں اضافہ ہو اور ہم یہ جان سکیں کہ ان پر قابو پانے کا کیا طریق ہے۔

(۲) یا معتزلہ کی زبان میں یوں کہیں کہ یہ عالم اپنی موجودہ شکل ہی میں بہترین (Best possible) ہے، اور شر و نقص کا احساس محض اضافی ہے۔ یعنی جزئیات کے ادھورے سے علم کی بنا پر ہے۔ اُس حکمت کی بنا پر نہیں جو ہمہ خیر اور خوبی ہے۔

(۳) اور یا پھر بدرجہ آخر اس نقطہ نظر کو مان لیں کہ اعتراض کی یہ نوعیت اس عالم سے متعلق ہے جو ہنوز معرض تعمیر میں ہے۔ یعنی اگر ارتقا کا عمل جاری ہے اور اس عالم امکان کو ابھی اور نکھرنا ہے اور تکمیل (اتمام) کی مزید منزلیں طے کرنا ہے تو کیوں نہ نقص و شر کے اس عیب کو عبوری اور عارضی شے قرار دیا جائے جس کو بالآخر انسان کی سعی اور کوشش سے مٹنا اور ختم ہونا ہے۔

ان مطالب کی تائید میں قرآن حکیم کے ان شواہد پر غور فرمایئے،

(۱) ذالک تقدیر العزیز العلیم یٰس ۳۸	یہ اندازہ ہے عزیز اور صاحب علم خدا کا۔
(۲) انا جعلنا ما علی الارض زینة لها لنبلوهم ایهم احسن عملا الکہف ۷	بلاشبہ جو کچھ زمین پر ہے اسے ہم نے اس کے لیے سنوارا اور بنایا تاکہ انھیں آزمائیں کہ ان میں کس کا کام بہتر ہے۔
(۳) هو الذی جعل لکم الارض ذلولاً فامشوا فی مناکبها وکلوا من رزقه والیه النشور الملک ۲	وہی ذات ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے رام کردیا تاکہ تم اس کے گوشوں میں چلو پھرو اور اس کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف جانا اور جی اٹھنا ہے۔
(۴) الشمس والقمر بحسبان الرحمٰن ۵	اور سورج اور چاند کا ایک حساب متعین ہے۔
(۵) قد جعل الله لکل شیء قدراً الطلاق ۳	اور اللہ تعالیٰ نے ہر ہر شے کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

© rasailojaraid.com

(۶) وسخر الیل والنہار والشمس والقمر والنجوم مسخرات (النحل ۱۲) — اور تمہاری خدمت میں لگا دیا رات اور دن کو سورج اور چاند کو اور تمام نجوم و کواکب کو بھی مسخر کر دیا۔

(۷) الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض (الحج ۶۵) — کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ زمین میں ہے، اس کو تمہارے لیے مسخر کر دیا۔

(۸) وما خلقنا السموٰت والارض وما بینہما لاعبین (دخان ۳۸ و انبیاء ۱۶) — اور ہم نے زمین اور آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔

وہ تیسرا نکتہ جو سائنس اور فلسفہ کی ارتقائی کڑیوں کو آگے بڑھانے کا باعث ہو سکتا ہے اور جس کی بدولت مسلمانوں نے تین چار صدیوں ہی میں علوم عقلیہ کو ثریا تک اچھال دیا، یہ تھا کہ فکر و دانش کی پرواز اور فطرت کے انکشافات میں کہیں ایسا موڑ نہیں آتا کہ جہاں دین کی استواریاں مجروح ہوں۔ قرآن حکیم نے جس نقطۂ نظر کی پرورش کی، اس کا حاصل یہ تھا کہ عقل و دین میں کوئی تضاد پایا نہیں جاتا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو پرتو ہیں۔ جس پروردگار نے انسانی روح کی تابش و ضو کے لیے اقدار کی تعیین کی ہے، زندگی کا نقشہ ترتیب دیا ہے، اور انسان کی عملی رہنمائی کے لیے فقہ و قانون کے حسین سانچے بخشے ہیں، وہ بھلا یہ کیوں چاہے گا کہ اس کی عطا کردہ عقل و خرد کی صلاحیتیں ان اقدار کے خلاف پڑیں، زندگی کے اس نقشے کی تغلیط کریں، اور ربوبیت کے اس پہلو کو جھٹلانے کا باعث قرار پائیں کہ جس سے مقصود ہی یہ ہے کہ انسان کو اس کائنات میں اس کا صحیح صحیح مقام عطا کیا جائے اور ان تمام فکری و عقلی اور عملی خوبیوں سے مکمل طور سے نوازا جائے جو اس کو خلافت الٰہیہ کی مسند بلند پر فائز کرنے میں ممد و معاون ہو سکتی ہیں۔ مذہب و عقل میں دوئی کی ایک ہی صورت ممکن ہے جو یہ ہے کہ ہم کائنات میں ثنویت (DUALISM) کے قائل ہو جائیں، اور اس بات کو مان لیں کہ مذہب و دین کے تقاضوں کی تکمیل و ارتقا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، اور عقل و خرد کی طرفہ طرازیوں کی تخلیق کا ذمہ کسی ایسی قوت نے لے رکھا ہے جس کا تعلق خیر کے بجائے شر سے ہے، تضاد و نفی سے ہے اور اس قوت نے عقل و خرد کی جدت طرازیوں کو پیدا ہی اس غرض سے کیا ہے تاکہ دونوں میں ہمیشہ ٹھنی رہے، اور کبھی بھی مصالحت اور یک جہتی قائم نہ ہو سکے۔ لیکن اگر انسان ایک ہے، اس کی فطرت ایک ہے، اور اس پوری

© rasailojaraid.com

کائنات میں ایک ہی خدا کی فرمانروائی اور حکومت کا سکہ رواں ہے، تب یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ ذہن و عقل میں تصادم و تضاد رونما ہو یا کسی درجے میں بھی دوئی پائی جائے۔ کیونکہ جب دونوں کا سرچشمہ ایک ہے، اصل اور جڑ ایک ہے تو اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان دونوں میں نہ صرف یہ کہ تضاد و تنافر نہ ہو بلکہ اس کے برعکس کامل ہم آہنگی اور اتحاد پایا جائے، اور یہی وہ طرزِ فکر اور اسلوب نگاہ ہے جس کو قرآن حکیم نے عقل و ذہن کے بارہ میں اختیار کیا ہے۔

مذہب اور عقل یا دین اور سائنس کے تجربات زندگی کے دو لاینفک پہلو ہیں، جن سے کسی بھی طرح ہم دامن کشاں نہیں رہ سکتے۔ اس لیے کہ اگر ہم علم کے اس ذریعہ پر اعتماد نہیں کرتے ہیں جو ہمیں لاکھوں انبیاء کی وساطت سے پہنچا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس عظیم تہذیبی و روحانی ورثہ سے محرومی اختیار کر لیتے ہیں جس سے کہ کردار اور اخلاق سنورتے ہیں، ایمان و یقین کی دولت بے پایاں کی تعمیر حاصل ہوتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کی وجہ سے ہمیں تگ و دو، اور جدوجہد کے لیے ایک متعین اور با معنی نصب العین دستیاب ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر ہم عقل و خرد کے تقاضوں کو بیدار نہ رکھیں۔ تحقیق و مشاہدہ سے کام نہ لیں، نئے نئے تجربات و انکشافات سے بہرہ مند نہ ہوں اور اس بات کا اندازہ نہ کریں کہ ہمارے تجربات اور غور و فکر کس حد تک فطرت کے رازہائے سربستہ کو فاش کر سکتے ہیں تو اس سے جو نقصان پہنچے گا اس کا تحمل کب آسان ہے؟ اس سے ہماری شخصیت نامکمل رہے گی یعنی اپنے ان مضمرات عقلی کے اظہار سے قاصر رہے گی جو زمان و مکان میں نئے نئے انقلابات کی تخلیق کرتے رہتے ہیں، اور تہذیب و تمدن کے دائرے سکڑ کر خشک ہو جائیں گے، فکر ٹھٹھر اور مردہ ہو جائے گی، اور زندگی کے پورے نظام کو وہ تازہ اور سازگار آب و ہوا میسر نہیں آسکے گی جس میں کسی زندہ و متحرک ثقافت کا نہال پھلتا پھولتا اور پنپتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں گویا ہمیں اگر بھرپور زندگی بسر کرنا ہے اور فکر و نظر کے دقائق سے لے کر قلب و روح کے لطائف تک ہر ہر شے سے استفادہ کرنا ہے تو ضروری ہے کہ ہم ایسا مدرسہ فکر تسلیم کریں جو دین و دنیا اور عقل و مذہب دونوں کی برکات کا یکساں حامل ہو، اور خدا کا شکر ہے کہ ہمارا مدرسۂ فکر اسلام اپنے دامن میں ان دونوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآن حکیم اس بات کی تصریح کرتا ہے کہ کسی شخص کے پہلو میں دو دل نہیں ہو سکتے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم عقائد و تصورات میں ثنویت برقرار نہیں رکھ سکتے یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے ہم کائنات، فطرت یا اپنے گرد و پیش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے حالات کے بارہ میں ایک رائے قائم کریں اور علوم و فنون سے اخذ کردہ نتائج کی بنا پر ہم جن تصورات و عقائد کو حق بجانب سمجھیں وہ دوسری نوعیت کے حامل ہوں۔ اگر مذہب و دین اللہ کا پیغام ہے اور اس علم ازلی کی فیض رسانیوں کا نتیجہ ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے بارہ میں کسی لغزش یا کوتاہی کا امکان نہیں تو پھر یہ ضروری ہے کہ اس سے اخذ کردہ تعلیمات کسی طرح بھی روح عصر کے منافی نہ ہوں یعنی کسی بھی دور میں علم و تجربہ کا کوئی بھی نیا انکشاف اہل حق کے حلقوں میں اچنبھا نہ پیدا کر سکے۔ بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ جب بھی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقیات سے کوئی نئی حقیقت فکر و نظر کے سامنے آئے ایسا معلوم ہو کہ اس میں کوئی انوکھا پن نہیں بلکہ اصولی حد تک یہ تو جانی پہچانی سی حقیقت ہے۔ ہاں یہ بات البتہ صحیح ہے کہ کبھی کبھی ان میں تصادم و تضاد محسوس ہوتا ہے اور وہ ایسی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ گویا یہ دونوں باہم حریف ہیں، جن میں فیصلہ کن لڑائی چھڑ گئی ہے اور بظاہر اب صرف یہی امکان باقی ہے کہ دونوں میں سے ایک زندہ رہے اور دوسرا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی شکست تسلیم کرے۔ جن لوگوں نے مغرب میں احیائے علوم کی تحریک کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ کلیسا اور سائنس کے مابین اس طرح کے متعدد موڑ آئے ہیں کہ جن میں دونوں حریف خم ٹھونک کر ایک دوسرے کے مقابلے میں آکھڑے ہوئے ہیں۔

لیکن تصادم کی یہ شکل عارضی ثابت ہوئی ہے اور بعد کی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ اصل میں ان دونوں میں تضاد و غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور یہ عموماً اس وقت محسوس ہوتا ہے جب یا تو مذہب و دین کی تعبیر صحیح اصولوں پر مبنی نہ ہو اور یا پھر سائنس اور علوم سے غیر سائنسی اور غیر علمی نتائج اخذ کیے جائیں۔ اگر مذہب کی تعبیر و تشریح میں ان سائنٹیفک اور علمی اصولوں کو مدنظر رکھا جائے کہ جن کی روشنی میں کسی بلند تر حقیقت کی صحیح معنوں میں تعیین ہوتی ہے اور سائنس سے صرف وہی نتائج اخذ کیے جائیں جو آخری اور اٹل ہوں تو ناممکن ہے کہ دونوں میں ذرہ بھی اختلاف رونما ہو۔

علاوہ ازیں یہ تصادم و تضاد بڑی حد تک ہماری جلد بازی اور بے صبری کا رہین منت بھی ہوتا ہے۔ ہماری عادت یہ ہے کہ سائنس کے ہر نئے انکشاف پر شور مچا دیتے ہیں کہ بس اب مذہب و دین کی خیر نہیں۔ حالانکہ وہ انکشاف کسی حیثیت میں بھی آخری اور فیصلہ کن نہیں ہوتا۔ بلکہ اگلے انکشاف کی محض تمہید ہوتا ہے۔ اور اگلا انکشاف اگر حرفِ آخر بھی ہو تب بھی اس سے اصول دین کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ بلکہ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے برعکس ہوتا صرف یہ ہے کہ بعض جزئی اور تشریح طلب مسائل میں مذہب و دین کی تشریح و تعبیر کا انداز و اسلوب بدل جاتا ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ لطیف اور زیادہ اونچا ہو جاتا ہے یہی نہیں زیادہ یقین افروز بھی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے قرآن حکیم نے مطالعہ کائنات پر بہت زور دیا ہے اور بار بار فکر و ذہن کو متوجہ کیا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش پھیلی ہوئی وسیع تر دنیا پر غور کرے۔ آسمان کو دیکھے۔ زمین کو دیکھے۔ اختلاف لیل و نہار کو ہدف تعقل ٹھہرائے۔ ہواؤں کے دوش پر سوار ہو۔ سحاب و ابر کی فیض رسانیوں کے حدود کا جائزہ لے۔ پہاڑوں کی استواری کو زیر بحث لائے۔ اونٹ کو دیکھے اور فطرت کے ان عجائب کو ملاحظہ کرے جو اس کی تخلیق میں ودیعت کر دیے گئے ہیں۔ فکر و نظر اور غور و تفحص کی یہ دعوت ہی تھا کہ یا پہلو ہے جس کی بنا پر مسلمانوں میں علوم عقلیہ کے لیے طلب و جستجو کے داعیے بیدار ہوئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان صحرانوردوں نے محض اسلام کی بدولت تہذیب و تمدن کے بلند ترین مناروں کو چھو لیا۔ اور طب، کیمیا، جغرافیہ، فلکیات، منطق، فلسفہ اور کلام میں اتنی ترقی کی کہ برسوں یورپ ان کی تحقیقات کا جویاں رہا۔

مطالعہ و مشاہدہ کی اس دعوت میں دو باتیں خصوصیت سے قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن نے جس فکر و تعمق کی دعوت دی وہ ارسطا طالیسی استخراجی فکر نہیں ہے کہ جو نتائج کے اعتبار سے بالکل عقیم اور بے ثمر ہے اور جس سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔ بلکہ اس فکر و تعمق کا مزاج استقرائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جزئیات کے مطالعہ و تجربہ سے کلیات اخذ کیے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ راہ ٹھیٹھ سائنس کی راہ ہے اور اس میں نت نئے انکشافات کا بہرحال خطرہ موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن حکیم کا اصرار ہے کہ تم اس نہج پر غور کرو اور اسی انداز سے سوچو۔ اور فکر و نظر کی ضیا افروزیوں کو عام کرو۔ اللہ تعالیٰ جو علام الغیوب ہے خوب جانتا ہے کہ اس راہ کے خطرات کیا ہیں اور اس مطالعہ و تحقیق سے علمی دنیا میں کیا کیا انقلاب آنے والے ہیں۔ اس کے ہوتے ساتے جب رب کائنات کا حکم ہے کہ مسلمان ذہنوں کو ٹھس نہ ہونے دیں۔ علم و تحقیق کی شمعوں کو روشن رکھیں اور تحقیق و تفحص کا پرچم چار دانگ عالم میں لہراتے رہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن جس نظام حیات کا داعی ہے اس میں اور عقل کی تیز رفتاریوں میں کہیں تصادم و تناقض کا خطرہ پنہاں نہیں۔

یہ ہے قرآن کا فلسفہ اور سائنس کی ترویج میں فکری حصہ۔ تفصیل اور حوالہ کے لیے درج ذیل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیات پر غور فرمایئے۔

اقم وجھك للدین حنیفاً فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا (روم ۳۰)

سو تم یکسو ہو کر رخ اس دین کی طرف رکھو اور اطاعت اس اسلوب کی کرو جو اس فطرت پر مبنی ہے کہ جس پر تمام لوگوں کو پیدا کیا گیا ہے۔

یوتی الحکمة من یشاء ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیراً کثیراً (بقرہ ۲۶۹)

حکمت و دانش جسے چاہتے ہیں ارزانی فرما دیتے ہیں اور جس کو حکمت و دانش سے نواز اگیا، اُسے بڑی چیز مل گئی۔

قد جاء کم بصائر من ربکم (انعام ۱۰۴)

بلاشبہ تمھارے پاس تمھارے پروردگار کی طرف سے بصائر آچکے ہیں۔

ومنھم من یقول ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار (بقرہ ۲۰۱)

اور ان میں کچھ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجیے اور آخرت میں بھی بہتری سے بہرہ مند کیجیے اور ہم کو آگ کے عذاب سے محفوظ رکھیے۔

ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفه (احزاب ۴)

اللہ نے کسی شخص کے سینہ میں دو دل نہیں رکھے۔

افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنینٰھا وزینّٰھا ومالھا من فروج والارض مددنٰھا والقینا فیھا رواسی وانبتنا فیھا من کل زوج بھیج تبصرة وذکری لکل عبد منیب (قٓ ۸)

کیا ان لوگوں نے اپنی اوپر کی طرف آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیونکر بنایا ہے۔ اور کیونکر آراستہ کیا اور سجایا ہے۔ اور اس میں کوئی رخنہ تک نہیں۔ اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور بچھایا۔ اور اس میں پہاڑوں کو جمایا اور اس میں ہر طرح کی خوش منظر چیزیں اگائیں اس لیے کہ اس کی طرف رجوع ہونے والا ہر بندہ ان پر غور کرے اور عبرت پذیر ہو۔

ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنھار والفلك التی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السماء

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں، اور یکے بعد دیگرے رات دن کے آنے میں، اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں۔ آدمیوں کے نفع کی چیزیں اور اسباب لے کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

من ماء فاحیا به الارض بعد موتها وبث فیها من کل دابة وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء و الارض لایٰت لقوم یعقلون (بقرہ ۱۶۴)

اور بارش کے پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا۔ پھر اس سے زمین کو زندہ کیا جب کہ یہ خشک ہو چکی تھی۔ اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو آسمان اور زمین کے مابین مسخر ہے۔ دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں

غرض یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو علم و فن کی ترقی ہوئی اور کندی، رازی، ابن ماجہ، ابن سینا، فارابی، اور ابن رشد و غزالی ایسے عظیم مفکرین پیدا ہوئے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ یونان و ایران کے سرمایہ تہذیب و تمدن نے ان کے قلب و ذہن میں یکایک تبدیلی پیدا کر دی تھی بلکہ اس کی بڑی اور بنیادی وجہ وہ داخلی انقلاب تھا جس کو قرآن حکیم کی تعلیمات نے پیدا کیا اور وہ تڑپ اور لگن تھی جو اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں خود بخود کاوش و جستجو کا باعث ہوئی۔ ورنہ یہ وہی عرب تھے جو کافور کو نمک سمجھتے تھے اور چاندی کو سونے سے زیادہ قیمتی جانتے تھے۔ جو طرح طرح کے اوہام کا شکار تھے۔

المعارف کی ضخامت میں اضافہ

ماہنامہ المعارف اب تک ۴۸ صفحات پر چھپا کرتا تھا
آئندہ ماہ (جولائی ۱۹۶۸) سے اس کی ضخامت ۶۴ صفحے ہو جائے گی،
لیکن قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

© rasailojaraid.com